ہجرت، بکھراؤ ، انتشار (Diaspora) اور اردو کے نمائندہ ناول نگار

مہرونہ لغاری

ABSTRACT:

During the last few decades world has seen a large number of world population migration due to multiple reasons particularly at the end of colonial rule.After the exit of colonial masters major third world countries couldnot bring economic prosperity even viability twinned with the dream of freedom forcing inceasible migration to western or European countries.Most of the diasporic motives contained materialistic objectives.World's literature analysis this trend under postcolonial theories.Prominent novelist of urdu literature gave a central space in their fiction writings to these diasporas in different prospectives.The researcher tried to find out the prominent features of urdu diasporic literature in novels.

آج کی اس پیچیدہ گلوبلائزڈ دنیا میں اپنے مرکز پر ٹھہراؤ خاصا مشکل امر ہے۔زندگی کی پیچیدگی اور تنوع کا مطالعہ کلچر میں تبدل اور تغیر سے با آسانی لگایا جاسکتا ہے۔اس تغیر اور تبدل کی زد میں سماجی اقدار (social taboos)، روایات ،تہذیب و ثقافت ،ترجیحاتِ حیات غرض ہر شعبہ زندگی ہے۔زندگی کی اقدار اب مادہ پرستانہ خواہشات کے تابع ہیں ۔عصر حاضر کی یہ ایسی حقیقت ہے جس سے فرار یا گریز ناممکن ہے۔ادب میں اس طرزِ احساس کے مظاہر متنوع صورتوں میں تشکیل پذیر ہوئے۔روح عصر کی مادیت کا ایک اہم عنصر ہجرت یا انتقالِ آبادی ہے۔جو اس دور کے انسان کی زندگی میں کسی نہ کسی طور پر وارد ہوئی اور ہو رہی ہے۔خواہ یہ جبری ہو، رضا کارانہ طور پر ہو، قانونی ہو یا غیر قانونی خارجی ہو یا ذہنی(۱) بہر حال نقل مکانی کا یہ سلسلہ آغازِ حیات میں جب زندگی اس طور پر متمدن نہ تھی تب جاری و ساری تھا ۔آج بھی اپنی روایت پر قائم ہے ''انسان وقت کے دھارے میں بہتا بہتا نہ جانے کہاں سے کہاں تک نکل آیا ہے۔اس سفر، مدام سفر میں اس نے نہ جانے کتنے ساحلوں پر کتنی بستیاں بسائی ہیں کبھی ایک بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی میں گھر بسا لیا ان میں گھل مل کر ان کی بستی کا

حصہ بن گیایا اجنبی، بیگانہ ہی بنا رہا۔نہ جانے کس کس کارن اس نے اپنی زمین اپنی تہذیب کو چھوڑا....اور خس و خاشاک کی طرح بکھر گیا۔ہجرت بن باس،خانہ بدوشی،نقلِ وطن و مکاں،جبر وتعذیب جلا وطنی،تقسیمِ وطن ،شہرِ ممنوعہ یا شہرِ تمنا،ارض،موعودہ یا جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں..حصول مسرت یا سکون کے لیے لیکن ایک بار اپنی زمین اپنے ماضی،اپنی جڑوں سے جدا ہو کر وہ اس ماضی اور زمین کو اپنے ذہن میں بسائے بے برگ و بار وقت کے پیٹرن میں مسلسل مبتلائے کرب بکھرتا چلا جاتا ہے''(۲)

آج جلاوطنی کے انسانی نفسیات پر جسقدر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں ۔وہ شاید ماضی میں اس قدر گہرے دور رس اور نفسیاتی نہ تھے۔۔اس میں شک نہیں کہ ادب میں اس تخلیقی تجربے نے گیرائی اور گہرائی کے احساسات کو نہ صرف مضبوط بنیادوں پر پیش کیا بل کہ ادب میں ہجرت کا تجربہ ہمیشہ تخلیقی سطح پر بڑا بارآور،اور زرخیز رہا ہے۔اور عموماً دورِ حاضر کے مقابلے میں ماضی میں اس کے ساتھ المیہ کو وابستہ کیا جاتا رہاہے۔لیکن آج کے دور کی بڑھتی ہوئی مادیت پرستی نے جس طرح بشر کے لیے معنوی سطح پر اشیاء کے مفہوم کو بدلنا شروع کیا ہے۔بعینہ انسان کی شعوری جذباتی وابستگیوں ،دل بستگیوں کے مفہوم میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔انسان جو ہمیشہ سے ارضی سطح پر ،اپنی جنم بھومی سے جڑا رہنا پسند کرتا تھا اور اس حوالے سے فینٹاسی پر مبنی تصورات اس کے شعور کا حصہ رہے ہیں ۔ باوجود اس کے کہ الہٰیات نے انسان کے اشیاء سے چمٹنے یا زمین سے وابستگی کے جذبات وتصورات کی حوصلہ شکنی کی ہے۔انسان پنے وطن کی سرزمین کو ماں یا ماتا کا رتبہ دے کر دھرتی یاجنم بھومی سے جڑا رہا یا رہنا پسند کرتا رہا۔اوراپنے گردو پیش سے وابستہ مناظر و مظاہر حیات سے جذباتی وابستگی اس کی گھٹی میں شامل رہی ہے۔یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں ہی ارضی لگاؤ کا شدید جذبہ بشری کمزوری کے طور پر سامنے آتا رہا ہے۔لیکن جدید دور کی سائنسی اور مادی ترقی کی دوڑ نے انسان کی اس کمزوری کو بھی ایک اور ہی جہت سے روشناس کرادیا ہے۔جہاں اخلاق ،مذہب،اعلیٰ انسانی اقدار،اوصاف وصفات بھی پانی بھرتے نظر آرہے ہیں ۔ اور وہ جہت مادیت پرستی ہے ،دورِ حاضر کی روحِ عصر مادیت کی مظہر ہے۔خصوصاً نو آبادیات کی زندگی کی تمام تر تگ و دو کا محور ومرکز[کارپوریٹ نظام کی عطا] مادیت پرستی ہے۔جب زندگی کا مطمحِ نظر یہی ہوتو نو آزاد اقوام مابعد نو آبادیات میں پھنسنے یا جکڑے جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی نظام میں مادیت پرستی کا یہ رویہ نہ صرف فرد کی کایا کلپ(ٹرانس فارمیشن) کا باعث بن رہا ہے۔بل کہ حیات کی وہ اہم اقدار جن کا تعلق اخلاق،اور مثبت طرزِ عمل سے ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہیں ۔فرد پہلے سے زیادہ اکیلا اور مادی خواہشات کے حصول کی مشین بنتا جا رہا ہے ۔یہ عجیب تضاد ہے جوں جوں دنیا گلوبل ویلج بنتی جارہی ہے فرد کے احساسِ تنہائی کو مقابلتاً گہرا کرتی جا رہی ہے۔۔بل کہ اس سے کلچر اور زبان میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔بیسویں اور اکیسویں صدی مسلسل تبدیلی کی زد میں ہے۔اس مادی تگ و دو میں بشر نے اپنی فطری کمزوری ،اپنی شناخت کا بنیادی حوالہ وطن یا ارضیت و سماجیت سے دست برداری کو بھی

قبول کر لیا ہے۔آج کا انسان خصوصا تیسری دنیا کے ممالک وطنیت کے اس روایتی تصورات سے آہستہ آہستہ آزاد ہو رہے ہیں ۔اور (نوآبادیاتی نظام کی جدید شکل)مابعد نوآبادیاتی نظام میں خود کوضم کر رہے ہیں۔اگرچہ تاریخِ انسانی کا ہجرت سے تعلق خاصا پرانا اور گہرا ہے۔اور عموماً ہجرت کی اس جبری شکل سے واسطہ رہا جو آغازِ آفرینش میں آدم وحوا،خدا کی معتوب قوم یہودیت ،آغازِ اسلام میں پیغمبرِ اسلامﷺ اور ان کے ساتھیوں اور کبھی جنگ و جدل،آفات کے زمانے میں متاثرین کی شکل میں ہوتی رہی ہے۔مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہولیکن:

> ''تاریخِ انسانی میں نقل مکانی کا عمل ایک مسلسل سفر کی صورت میں اثر پذیر ہوا ہے۔جو محض جسمانی سفر ہی نہیں بل کہ ذہنی سفر بھی ہے یہ ہی ذہنی سفر انسان کو بیک وقت حال اور ماضی میں یکساں متحرک رکھتا ہے۔جو بالآخر ناسٹلجیا کی دین ہے'ناسٹلجیا کا یہی وہ تخلیقی جذبہ ہے۔جو ساں بیلو،اور آئزک سنگر سے پولینڈ کی'' جنت گم گشتہ'' کا یاد نامہ رقم کرواتا ہے۔جوزف کانریڈ کو اجنبی سر زمینوں کی طرف لے جاتا ہے۔اسی احساس کی لو میلان کنڈیرا کو اپنے لوگوں اور اپنی مٹی کی بنتی بگڑتی صورتوں کے خواب دکھاتی ہے۔۔۔البرٹ کامیو کے اجنبی سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔لیکن دنیا بھر کے افسانوی اور داستانوی ادب میں کتنے ہی اجنبی ہمیں نظر آتے ہیں جو اپنی مٹی سے دور ہیں اور اس کی یاد ان کی تہوں میں سرسراتی ہے'' (۳)

خود برصغیر پاک و ہند کا یہ خطہ بھی ہجرت اور حملہ آوروں کی تاریخ کے حوالے سے خاصا زرخیز رہا ہے۔لیکن انیسویں صدی میں اس خطہ نے اپنی تاریخ کی ہولناک ترین ہجرت کا تماشا کیا۔جس نے اپنے جلو میں فسادات سے لاکھوں انسانوں کے خون سے خراج وصول کیا ۔ہجرت کا یہ تجربہ المیہ کی ایک ایسی شکل اختیار کر گیا جس کا ادب ،سیاست،معیشت اور عمرانی نقطہ نظر سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔نوآبادیاتی نظام ہو یا مابعد نوآبادیاتی ہر دو نے اپنے دائرے میں آنے والی اقوام سے خراج ہر سطح پر وصول کیا ہے۔یہ خراج وسائلِ فطرت اور بشر دونوں صورتوں میں اپنی مفتوح یا معتوب(Targeted)قوم کو ہجرت سے دو چار کرتا رہا ہے۔''یورپی نوآبادیاتی نظام نے خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے لوگوں کو اپنے ہی وطن میں بے گھر ،جلاوطن اور اجنبی بنادیا۔الجزائر کے جو یورپ کی نوآبادی (colony) تھا ، ادب میں جلاوطنی کی ایسی نوعیت ملتی ہے۔جس میں لوگ خود اپنے وطن میں رہتے ہوئے جلاوطن ہو گئے ہیں اور یورپی جارحیت کو برداشت کر رہے ہیں'' (۴)

کلچر اور زبان میں تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے جب ان کا واسطہ ایک مختلف کلچر اور زبان سے پڑتا ہے۔اس کی روشن مثال خود برصغیر پاک و ہند کا خطہ ہے جہاں آریاؤں،مسلمان فاتحین اورصوفیاء کرام کی آمد،ان کے مقامی آبادی سے باہمی میل جول کے نتیجہ میں ایک ملے جلے کلچر نے فروغ پایااور ایک نئی زبان وجود میں آگئی ۔کسی نئے کلچر کی یا زبان کی تشکیل و شناخت کے مراحل میں نسبتاً کمزور جہت کے افراد اور کلچر کو شکست و ریخت کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دورِ جدید میں ہجرت ایک ایسے کلچر کو فروغ بھی دے رہی ہے جہاں میزبان کلچر اور مہاجریت ایک دوسرے سے زبان اور کلچر کے نئے مباحث اور تناظرات پر مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اسٹورٹ ہال کے نزدیک

”Our capacity to live with differences is the question of 21 Century(۵)“

”جلا وطنی ،ہجرت ،ترکِ وطن ،بکھراؤ “ دورِ حاضر میں انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں آج بھی طاقتور عنصر ہے۔مابعد نو آبادیاتی مطالعہ میں اس کے لیے ڈائیا سپورا (Diaspora) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔یہ لفظ یونانی الاصل ہے جو دو متضاد معنی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔Dia بمعنی بکھیرنا،انتشار ،تقسیم اور spora بمعنی بیج بونا۔جہاں ایک طرف اس ترکیب کا ایک حصہ(Dia) انتشار اور بکھراؤ کا غماز ہے۔تو اس کا دوسرا حصہ استحکام یا نئی جڑوں اور نئی زندگی کے آغاز کا اظہار ہے۔(۶)

ڈائیا سپورا یا بکھراؤ،انتشار یا جلا وطنی کی اصطلاح مابعد نوآبادیاتی مطالعہ میں یہودیوں کی جلا وطنی اور ان کی وطن واپسی کی شدید خواہش کے سیاق سباق سے جڑی رہی۔ولیم سفران نے ۱۹۹۱ میں اس کا تاریخی تناظر میں جائزہ لیا اور اس اصطلاح کے خدوخال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے یہودی بکھراؤ یا انتشار کو اپنے سامنے ایک رول ماڈل کے طور پر رکھا(۷) اس بکھراؤ اور انتشار کے پیچھے جو محرکات ہیں ان کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک جلا وطن یا تارک وطن اپنی جنم بھومی سے زبردستی ،سیاسی،معاشی ،معاشرتی دباؤ کے تحت جدا کر دیے جاتے ہیں۔لہٰذا وہ اپنے احساس مہاجریت کے ساتھ کسی اجنبی دیس میں ،اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔شعوری یا لاشعوری طور پر وہ میزبان دیس میں اپنی جڑیں پیوست نہیں کرنا چاہتے۔ وطن اور ماضی کی کرب ناک یادوں(ناسٹلجیا) کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں ۔ ولیم سفران کے نزدیک ہندوستانی(پاک و ہند) ڈائیا سپورا اپنے آبائی وطن سے قدامت پسندانہ یا کٹر (Rigid)لگاؤ رکھتے ہیں۔اپنے ملک کی ترقی اورخیر خواہی کے لیے کوشاں رہتے ہیں وہ کبھی نہیں بھلاتے کہ بالاخر انھیں اوران کی اولاد کو یہ ملک چھوڑ کر جانا ہے۔اور یہ کہ نیا ملک یا نیا کلچر انھیں کبھی قبول نہیں کرے گا۔لہذا بے گانگی اور اجنبیت کا احساس ان کے ہاں دو چند ہے ۔نئی سرزمین ان کے لیے اجنبیت ،مغائرت، بے گانگی،ذہنی تنہائی اور فرقت لاتی ہے۔انھیں لگا تار یہ احساس رہتا ہے کہ ان کا پشتینی وطن ہی ان کا اصل وطن ہے۔ نئے ملک کی ثقافتی روایات انھیں اجنبی،سرد مہر اور نامانوس لگتی ہیں ۔وہ اپنی یا اپنی نسلوں کو میزبان ثقافت میں مدغم نہیں کرنا چاہتے۔ان کا مذہبی و نسلی شعور انھیں اپنی آبائی شناخت کی حفاظت پر مجبور کرتا ہے۔ وہ بے جڑ ہونے کے کرب میں مبتلا رہتے ہیں ۔ ان کے لیے اپنی شناخت اور تشخص سب سے بڑا مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ڈائیا سپورک ادب کا سب سے بڑا سوال تہذیبی شناخت کا ہے۔ادیب جو آج سے کچھ عرصہ پہلے فرد کی گمشدگی کا اعلان کر رہا تھا آج اپنی تہذیبی شناخت کے لیے نوحہ کناں ہے۔فرد کے تشخص کی شناخت کے بارے میں پروفیسر صغریٰ افراہیم لکھتی ہیں :

”ادب شناخت کو بنانے اوران کی تصدیق کا ایک طریقہ کار ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہمارے

زمانے کی ایک علامت کے طور پر شناخت کی سیاست کو ایک ایسی بین مرکزیت حاصل ہوگئی ہے جس نے ادب کے روایتی تصورات کو پس پشت ڈال کر انھیں از کارِ رفتہ بنا دیا۔ایک جہت میں چلنے والا ادب مثلاً نوآبادیاتی ادب،ہجرت اور ترکِ وطن کا ادب(Daispora)صیہونی ادب ساہ فاموں کا ادب،نسائی ادب، ہم جنسی کا ادب،دلت ادب،اقلیت کا ادب،زندانی ادب،احتجاجی ادب وغیرہ یہ سبھی تصورات شناخت کو سب سے اہم اور بنیادی مسلہ قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں''(۸)

ہجرت کا تجربہ جو اپنی قدامت میں اتنا ہی بزرگ ہے جتنا کہ خود بشر،انسان کی زندگی اور خصوصاً جدید دور میں پوسٹ کا لونیل نظام کے تحت حیاتِ انسانی میں جن تغیرات،اور نفسیاتی مد و جذر کا سبب بن رہا ہے۔میرا یہ آرٹیکل اردو ناول کے نمائندہ تخلیق کاروں کے ہاں اس طرزِ احساس کو بیان کرنے اور اس کی تحدیدات کے تعین کے لیے چند نکات کی پیش کش کی کوشش ہے۔

ادبی متون اور خصوصا پوسٹ کالونیل تصورات میں تارک الوطن کے مسائل یا ان کی کش مکش حیات کا بیانیہ ایک واضح عنصر کے طور پر موجود ہے۔ مابعد نوآبادیاتی سماج تہذیبی و جغرافیائی بکھراؤ کو جنم دیتا ہے۔ پوسٹ کالونیل تصورات ایک دنیا کی شناخت اور دوسری محکوم وکمزور یا اصطلاحاً تیسری دنیا کے معدوم ہونے کی بازگشت ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے مطابق ''یہ دنیا کسی غیب،کسی عدم سے اچانک خدائی حکمت سے وجود میں نہیں آئی بل کہ ایک دوسری دنیا کی شکست و ریخت کے سوچے سمجھے پراجیکٹ کے طور پر وجود میں آئی ہے۔''(۹)یہ دراصل وہ نظام ہے جو مالیاتی نظام پر اپنی جڑیں رکھتا ہے اور اقدار حیات کو خالصتاً مادیت کے تناظر میں دیکھتا ہے۔مابعد نوآبادیات کی اصطلاح سب سے پہلے ایمی سیزائر(۲۰۰۹۔۱۹۱۳ء)اور فرانز فینن (۱۹۶۱ء۔۱۹۲۵ء)نے استعمال کی پھر ۱۹۷۸ء میں ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب اورینٹل ازم [Orientalism] میں استعمال کی ۔

''اس نظام میں استعمار کار کو کم وبیش ہر سطح پر اجارہ حاصل ہوتا ہے۔اس لیے مذکورہ ثقافتی رشتے دراصل طاقت کے رشتے ہیں استعمار کار طاقت کی اکثر صورتوں (سیاسی،علمی، معاشی، تعلیمی،فنی) کو خلق کرنے اور نوآبادیوں میں سیاسی ،آئینی اور تعلیمی اصلاحات کے ذریعے ان کے نفوذ کو ممکن بنانے کی پوزیشن کا حامل ہوتا ہے۔جس کے نتیجے اور ردِ عمل میں نوآبادیات میں نئی تہذیبی،علمی،فکری اور ادبی روشیں پیدا ہوتی ہیں ۔مابعد نوآبادیاتی تنقید،ثقافت / طاقت کے انھی رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے جن میں استعمار کار کو بالا دستی حاصل ہوتی ہے۔''(۱۰)

نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ پر جس ہجرت کا مشاہدہ برصغیر کی تاریخ کے پنوں میں رقم ہوا۔اس کے حوالے سے خبری سطح پر بھرپور ڈاکیومنٹیشن کی گئی ۔تو ادب میں بھی اس حوالے سے ردِ عمل خاصا شدید ہوا۔ہجرت خواہ نوآبادیاتی نظام کے اندر ہو یا مابعد نوآبادیاتی نظام کے تحت ،اپنے مہاجرین کو جس احساس مہاجریت میں مبتلا کرتی ہے اس کی دو ایک جہات کو چھوڑ کر نفسیاتی اور جذباتی سطح پر بہت سی اقدار مشترک ہوتی ہیں ۔

بہر حال ۴۷ء کی ہجرت کا ادب میں بھرپور اظہار کیا گیا ہے'میرے خیال میں اردو کے اختراعی ادب کے لیکھکوں کے سامنے ڈائی سپورا(Diaspora) سب سے اہم سوال برصغیر کی آزادی کے بعد فی الوقت ہونا چاہیے۔۔۔برصغیر ہند کا اردو ڈائی سپورا کا مسلہ اس کا مسلم متوسط طبقہ ہے۔جو ابھی تک اپنی اس غرہ سے نجات نہیں پا سکا کہ کبھی ان (Urdu Diaspora) کے آباء واجداد نے وہاں حکومت کی تھی۔تو دوسری جانب آزادیِ بر صغیر ہند پچاس ساٹھ برس بعد بھی احساس کم مائیگی میں مبتلا ہے اور مغرب کی وکٹوریائی اقدار کی علویت کے زیر اثر ہے''(۱۱)۔ ادب میں یہ اظہار کہیں تو اس اخباری اور خبری سطح پر ہوا جہاں دونوں اطراف مارے جانے والوں اور متاثرین کی عددی خبر کا رویہ تھا(اس کا زیادہ تر اظہار افسانوں میں ہوا)اور کہیں اسے وسیع تر سماجی ،مذہبی ،معاشرتی تاریخی تناظر میں انسانی المیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں اردو ادب کے نمائندہ ناول نگاروں نے اپنا حصّہ ڈالا۔اس دور کے ادیبوں نے اس خطہ کی عمومی سائیکی کے برعکس اسے نوشتہ تقدیر کا درس دینے کی بجائے بشری سطح پر پیش کیا۔برصغیر میں ہجرت کا عمل تقسیم اور فسادات کے بعد پوری شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔لیکن جیسے ہی یہ واقعات پرانے ہوئے اس کی شدت کم ہوگئی۔یہ گویا کافی حد تک ہنگامی نوعیت کے واقعات تھے۔جس پر فوری ردعمل ہوا۔اگر چہ اس کے اثرات اب بھی ہیں لیکن گذشتہ دوعشروں سے ہجرت کی جو نوعیت دیکھنے میں آرہی ہے۔اس کے براہ راست ڈانڈے بین الاقوامی سیاست سے جا ملتے ہیں خصوصاً 9/11 کے اثرات تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑے۔خصوصاً وہ معاشرے جو نوآبادیاتی نظام سے آزاد اور مابعد نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر تھے۔ہندوستانی مہاجرت کا تعلق تاریخی ،سیاسی ،معاشی ،تعلیمی ،بہتر روزگار جیسے محرکات سے ہے۔لیکن ہندوستانی ڈائیا سپورا نے پاکستانی ڈائیا سپورا کے مقابل میں اپنی اس ہجرت کو مثبت سمت دی ہے۔ان کے لیے اب ترک وطن اس طرح سے تکلیف دہ نہیں ہے جیسے کہ پاکستانی ڈائیا سپورک ادب میں نظر آتا ہے۔اگر چہ اپنے وطن کی فراقت خاصی تکلیف دہ اور فطری ہے لیکن ہندوستانی ڈائیا سپورا نے اجنبی دیسوں میں اپنی کمیونٹی کے ارتباط اور باہمی میل جول سے اس احساس تنہائی ،فرقت کے احساس کو کم کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ہندوستانی جلا وطن یا ڈائیا سپوک ادب اس سلسلے میں پاکستانی ادب سے مختلف اسی روش کا اظہار کر رہا ہے۔ہندوستانی ادیبوں کے ہاں بھی پاکستانی ادب سے مختلف طرزِ احساس جنم لے رہا ہے۔اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد لکھتے ہیں

> ''جوگندر پال کا ناول ''خواب رو''ہجرت کے سروکاروں کو جو کہ بین الاقوامی موضوع ہے پیش کرتا ہے اور اس میں اس بصیرت کو پیش کرتا ہے کہ جب ہجرت مقدر ہی بن جائے۔تو روگی بن جانے کے بجائے نئی سرزمین میں دوسرے پودوں کے ساتھ اپنا پودا لگایا جائے۔کیوں کہ بقا یا survival اسی میں ہے ورنہ مقامی آبادی سے ٹکراؤ میں سماجی اور معاشی انتشار پھیلتا ہے۔''(۱۲)

اسی طرزِ احساس کا نتیجہ ہے کہ جو ادب جلا وطنی کے حوالے سے لکھا جا رہا ہے۔وہ نوآبادیاتی سماج میں

اپنے لیے جگہ پیدا کرنے میں مدد دے رہا ہے۔اور غالباً ہند تہذیب (یہاں مراد ہندو کمیونٹی اور ہندو ذہن سے ہے) کی دیگر اقوام کے ساتھ باہمی میل جول یا ربط پیدا کرنے کی بہترین صلاحیت ہی اس کی ترقی اور وقت کے تقاضوں ساتھ ہم آہنگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔جب کہ پاکستانی جلا وطن ادب (ڈائیا سپورک ادب) کی جہات کا آغاز ہی ایسے ادیبوں نے کیا

''جو ہجرت کر کے نئے ملک پاکستان آئے تھے۔۔۔انھوں نے ہجرت تو کی مگر اپنی یادوں میں آبائی وطن کو بسائے رکھا۔یہ بات خاص طور پر ہندوستان سے آئے ہوئے ادیبوں کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔یہ کرب اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب انھیں اور ان کی طرح دوسرے لوگوں کو ان کی امید وں اور خوابوں کی سرزمین پاکستان میں اپنی حیثیت کا احساس ہوتا ہے''(۱۳)

''آج اگر یادوں کے چراغوں کی لو میں لکھنے والوں کو آپشن دی جائے کہ وہ جہاں جو کچھ چھوڑ کر آئے ہیں، واپس جا کر وہیں بس جائیں تو شاید کوئی ایک بھی اس سودے پر تیار نہ ہوگا کہ یہاں کی خوشحالی، نام اور مقام انھیں یادوں کی راکھ کریدنے سے ہی تو ملا ہے یہ وہ اعتراض ہے جو پاکستان بننے کے چند برسوں بعد ہی اٹھایا جانے لگا تھا۔جس کا جواب یہ ہی ہوسکتا ہے۔کہ ہجرت ایک تخلیقی تجربہ بن گیا ہے۔۔۔اس کے بنیاد گزاروں میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام اولین حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اسے ایک روحانی اور باطنی تجربے کے طور پر پروان چڑھایا۔''(۱۴)

''قرۃ العین حیدر کی بیش تر تخلیقات کا بنیادی سروکار بکھراؤ (diaspora) ہے۔۔۔ان لوگوں کے بکھرنے کا عمل جن کی نمو کا سرچشمہ ایک ہے، ثقافتی پس منظر ایک ہے۔جن کے بیش تر رسم و رواج ایک ہے۔جو بارہا ایک زبان، خطہ زمین، عقیدے، مشترک اقدار، اور معاشرے سے، ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور جن کا کھوئے جانے کا کرب ایک ہے''(۱۵)

''ہمارے دماغ خالی ہیں، ہماری روحیں خالی ہیں، ہم کچھ سوچنا نہیں چاہتے کچھ سمجھنا نہیں چاہتے، ہماری آواز میں اپنی آوازیں نہیں ہیں۔ہماری آوازیں کہیں گم ہوگئیں ہیں۔ہم سر گوشیوں میں بھی کچھ نہیں سن سکتے، ہم اپنے دلوں سے بھی باتیں نہیں کرتے، وہ جو اسی طرح آنکھیں کھولے کھولے اندھیرے کے اس پار پہنچ گئے، ان کی پتلیوں میں ہماری تصویریں اسی طرح رہ گئی ہیں جس طرح اب ہم تمھارے سامنے کھڑے ہیں، (میرے بھی صنم خانے)

''ہم جہاں بھی رہیں ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں۔وہ خطہ جس نے ہمیں جنم دیا ہے ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو اور ہمارا بیش تر ادب نوسٹلجیا کا ادب ہے اور اس کی یہ خصوصیت ۱۹۴۷ء کے بعد بالکل لازمی اور جائز اور حق

بجانب ہے۔''(۱۶)

''موجودہ دور جسے مابعدنو آبادیاتی دور کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے۔اس میں زبان و ادب اور مذہب و ثقافت کی بے دخلی نے جو شدت اور وسعت حاصل کی ہے۔اس کی روداد قرۃالعین حیدر سب سے زیادہ معتبر اور فن کاری سے رقم کرتی ہیں ان کے افسانوں اور ناولوں کے کردار ایک ایسے بکھراؤ سے گزرتے ہیں کہ زمان و مکاں میں ان کے مقام کا تعین دشوار ہو جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ یہ بکھراؤ حقیقی ہی ہو یا وہ خارجی حالات یا جبر کے باعث ہو۔یہ ذہنی کیفیت بھی ہوسکتی ہے۔ایک فرضی خیال ،ایک واہمہ۔۔۔سائمن فقیرا، ذاینا روز ،کارمن، کنول کماری، کشوری، تنویر فاطمہ، آفتاب رائے، اقبال بخت سکینہ ،سلمیٰ، میرزا، سیتا میر چندانی، جمشید، ثریا حسین، گریس، سلمان بھائی زبیدہ صدیقی۔۔۔مختلف سمتوں، اور زمینوں سے بکھر کے آئے یہ لوگ، کسی ایک مقام یا وقت کے ایک نقطہ میں ملتے ہیں لیکن یہ قرابت ان کے ذہنی انتشار کا باعث بن جاتی ہے۔''(۱۷)

''پھر اس نے کہا ،دراصل سیتا! تم مجھے بے حد غیر جذباتی سمجھتی ہو، مگر جلا وطنی کا مسئلہ مجھے بھی پریشان کرتا ہے۔مغربی برلن میں ،ہانگ کانگ میں ہر جگہ میں نے پناہ گزینوں کو دیکھا ہے۔امریکن شہروں میں مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگوں سے ملا ہوں ،جاڑوں میں فلسطین کے مہاجروں کی حالت دیکھی ہے اور میں جو بات بات میں تم سے الجھتا ہوں اور تمھاری ہر بات مذاق میں ٹالنا چاہتا ہوں ،اس کی وجہ یہ ہے ہم ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں چالیس کروڑ انسانوں کی نفسیات یک سر بدل گئی ہیان کے خیالات نظریے، جذبات، رد عمل....''

یہ قرۃالعین حیدر کی کہانی ''سیتا ہرن سے ایک مکالمہ ہے۔کہنے والا عرفان ہے جو اودھ سے ہجرت کر کے کراچی جا بسا ہے جس سے کہا گیا ہے۔وہ سیتا میر چندانی ہے۔۔۔عرفان سیتا پر یہ جتا رہا ہے کہ تقسیم اور فسادات کے اثر سے اُکھڑنے والی خلقت کے بارے میں وہ غیر جذباتی نہیں ہے۔مگر اس کا بیان کچھ اور غمازی کر رہا ہے یہ کہ اس نے اپنی ذات اور حلقے کے گروہ سے نکل کر بھی دیکھا ہے اور دیس دیس بھٹکتے پناہ گزینوں کا مشاہدہ کیا ہے۔اس لیے اب اس قصے کے بارے میں اس کے ہاں ایک معروضی رویہ پیدا ہوگیا ہے۔کچھ اسی قسم کی بات اس افسانے کی روشنی میں قرۃالعین حیدر کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔۔۔''قرۃالعین حیدر کی کہانیوں اور ناولوں کا موضوع براہ راست فسادات نہیں بل کہ فسادات سے پیدا ہونے والی نقل مکانی کی ابتلا ہے۔جسے پاکستان میں آنے والوں نے ہجرت جانا اور اپنے آپ کو مہاجر کہا۔اور ہندوستان پہنچنے والے شر نارتھی کہلائے۔قرۃالعین نے اس تجربہ کو اپنی مختلف کہانیوں اور ناولوں کو اس گروہ کے واسطے سے دیکھا اور بیان کیا جس کا وہ خود بھی حصہ ہیں ۔یہ الگ بات ہے کہ ان کا نقطۂ نظر اس تجربے کے بارے میں اپنے گروہ کے عمومی نقطہ سے مختلف تھا۔بہر حال اس

کہانی میں وہ اپنی ذات اوراپنے گروہ کے حلقہ سے نکل کرغیر کے واسطہ سے اس تجربہ کو سمجھنے کی کوشش کرتی نظرآتی ہیں اس واسطے سے ان کے لیے اس تجربے کو ایک معروضیت کے ساتھ دیکھنے اور بیان کرنے کی گنجائش نکل آئی ہے۔"(۱۸)

انتظارحسین کے ناولوں کا بنیادی تھیم احساس جلا وطنی ہے۔جو وقت کے جبر کا نتیجہ ہے۔یہ جلا وطنی جو بغیر کسی نصب العین کے جبری سطح پر وقوع پذیر ہوئی۔انتظارحسین کے یہاں ہجرت یا انتقالِ مکانی ماضی ،تہذیب،خطہ زمین سے بچھڑ جانے کے احساس کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔اس نے انتظارحسین کے آدرشوں کو متزلزل کر دیا۔جہاں ان کے کردار بے یقینی،اور مغائرت کو اپنی ذات کا حصہ بنتے دیکھتے ہیں۔ان کا بنیادی مسئلہ معاش اور شخصی و ثقافتی شناخت کا ہے۔تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اس جلا وطنی نے انھیں جگہوں، مقامات، چرند پرند یہاں تک کہ آبائی قبروں سے محروم کردیا ہے جہاں ان کے پاس واپس جانے کے راستے مسدود ہیں۔اگر چلے بھی جائیں تو بھی ہر وہ چیز جس سے ان کا شعور اور لاشعور واقف ہے اپنی جگہ پر موجود نہ ہوگی۔

ڈاکٹر انواراحمد انتظارحسین کا"ایک بڑے تخلیقی تجربے کے امانت دار" کےطور پر تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگر چہ ثقافتی رس اور مہک کے ساتھ مٹی بھی انتظارحسین کا عشق ہے۔تاہم ہجرت انتظارحسین کے لیے محض گلی کوچوں اور بستیوں کی خاک سے بچھڑنے کا مسلہ نہیں،آباؤاجداد کی یادگاروں ،روایتوں اور رسموں سے بچھڑنے،تاریخ اور تہذیب کی شہادتوں سے منقطع ہونے اور اپنے تخلیقی وجود کی شکست وریخت کا معاملہ ہے۔"[۱۹]

انتظارحسین کا احساس مہاجریت یا ڈائیا سپورا جڑوں سے کٹ جانے کے المیائی احساس سے جنم لیتا ہے۔جہاں وہ کربناک یادوں کے حصار میں چلے جاتے ہیں۔اپنی شناخت کے سوالات بھی انھیں پریشان کرتے ہیں جڑوں سے اکھڑ جانے کا عمل ان کے یہاں یاس انگیز فضا تخلیق کرتا ہے۔انتظارحسین کے یہاں ہجرت ماضی کی گمشدگی،تہذیبی جڑوں سے کٹ جانے کا عمل ہے۔یہ وہ چیزیں ہیں جو انتظارحسین کو ماضی کی کربناک یادوں یا Nostalgia میں دھکیل دیتی ہیں۔ان کی تہذیبی جڑیں زمین میں پیوست ہیں

> "انتظارحسین کے زیادہ تر افسانے ان چہروں اور ان لمحوں کو یاد کرنے کے عمل سے وابستہ ہے جنھیں وقت نے دور کردیا ہے انتظارحسین کی دانست میں یاداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے۔یاداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہو تو بنیاد اور جڑیں کچھ بھی نہیں رہتا"[۲۰]

انتظارحسین نے ہجرت پر مبنی کئی افسانے لکھے۔جب کہ ان کے ناول"بستی" اور"آگے سمندر ہے" اس طرز احساس کے نمائندہ ناول ہیں اگر"بستی" قیام پاکستان کے نتیجہ میں اپنی جنم بھومی سے بچھڑ جانے کے طرز احساس کا احاطہ کرتا ہے تو"آگے سمندر ہے" میں نئے ماحول میں جڑ پکڑنے کی زبردست کوششوں کا احوال ملتا ہے۔ "سراج منیر نے انتظار کی کہانیوں پر مضمون لکھتے ہوئے انتظار کے ہجرت کے عمل کے بارے میں بڑی بصیرت

افروز بات کہی ہے۔وہ لکھتے ہیں

''ہجرت ایک زمین سے دوسری کی طرف سفرنہیں ہے۔بل کہ رشتوں کے جو انسانوں کے درمیان ہوں ،ان علامتوں کے جو ان سے ظاہر ہوں ان ترجیحات اور معنویتوں کے پورے نظام سے جو اس سرزمین پر ایک تاریخ نے قائم کی ہوں ۔سفر ہے''[۲۱]

انتظارحسین کے ہاں جلا وطنی یا بکھراؤ کا احساس دو جہات سے بحث کرتا ہے۔ایک نئے ملک میں اپنی جڑیں دوبارہ سے قائم کرنا،لیکن اپنے پشتینی وطن سے کٹ کرنئی مٹی میں جڑیں پانا اور اسے مضبوط کرنے کی فکر میں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نیا ملک یا شہرتو سمندر کنارے بسا ہوا ہے

''سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔وہ تو پانی میں تیرتا ہے''[۲۲]

''وہاں ندیوں کی مٹی تھی یہاں سمندر کی ریت ہے''[۲۳]

دوسرے اس ملک میں اپنی شناخت کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔فی الوقت یہ واحد متاع ہے جو انتظارحسین کے مہاجر کردار بچانا یا سینتنا چاہتے ہیں۔

''ان سب کے درمیان جو امر مشترک ہے۔وہ یہ ہے کہ ان کا حال ان کے ماضی سے جسقدر بھی مختلف سہی لیکن وہ ماضی کو نہ بھلا دینا چاہتے ہیں اور نہ بھلا سکتے ہیں ۔نئی مملکت میں قیام پذیر ہونے اور اس میں کسی قدر استحکام پیدا کرنے کے بعد ان کا سب سے مہتمم بالشان مسلہ اپنے قومی تشخص کو پہنچوانا اور اپنی انفرادیت کے واضح نقوش کو منوانا ہے''[۲۴]

لہٰذا انتظارحسین کے یہاں یہ ہجرت یا بے دخلی ،بکھراؤ خطہء زمین ،زبان،ثقافت وتہذیب،گھر بار ، چرند پرند،درخت،ماحول، معاشرے لوگوں،رسوم،اقدار و روایات سے کٹ جانے یا بچھڑ جانے کے شدید احساس سے وارد ہوئی۔ان کے ڈائیا سپورک کرداروں میں اپنی جنم بھومی اور مظاہر فطرت سے شدید لگاؤ کی کیفیت سامنے آتی ہے۔انتظار نئی سرزمین میں اپنے حال کا تعلق ماضی سے جوڑے رکھتے ہیں یاں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے کرداروں میں ماضی کے لیے مثالیت پسندی کا رویہ سامنے آتا ہے۔نئی سرزمین میں وہ اپنی شناخت کے اثبات کے لیے کوشاں ہیں ۔انتظار کے یہاں ماضی کی یہ بازیافت حال کے بہتر تجزیہ کے طور پر بھی وارد ہوتی ہے

بستی''ناول میں توجہ کا محور پاکستان کی طرف ہجرت کا واقعہ ہے اور اس واقعہ سے پیدا شدہ گونا گوں انفرادی و اجتماعی مسائل جو ایک طرف سے پیچ در پیچ ہیں لیکن اس میں جو گہرا رمزمستر ہے وہ ہے اس مٹی سے کٹ جانا۔جو وجود کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔اسی ہجرت کی ذیل میں ماضی سے نہ ہٹنے والے اور اس میں ملوث ذہن میں جو کھچڑی پکتی رہتی ہے۔اسے بڑی صراحت ،تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔''[۲۵]

''مجھے اپنے گم شدہ پیڑ یاد آرہے تھے، گم شدہ پیڑ، گم شدہ پرندے، گم شدہ صورتیں،نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا،صابرہ، لمبے جھونٹے،نیم کی نبولی پکی،ساون کب کب آوے گا۔''[۲۶]

''یہاں سے پورے پورے خاندانوں نے ہجرت کی ہے اور پیچھے کوئی ایک فرد رہ گیا ہے۔مگر یہ فرد بالعموم بوڑھا آدمی پایا گیا ہے۔اکیلے رہ جانے والے ان بوڑھوں کو جائداد کے خیال نے نہیں روکا ہے،قبر کے خیال نے روکا ہے۔۔۔۔ذرا قریب جا کے دیکھو۔ایک سے ایک گھنا پیڑ ہے۔پاکستان میں میری قبر کو ایسی چھاؤں کہاں ملے گی۔۔۔یہاں پیچھے رہ جانے والے بوڑھوں کو دیکھ کر میں نے جانا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب میں قبر کتنی بڑی طاقت ہے۔'' [۲۷]۔

''یار یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی ایک بستی اپنے ایک باسی کے لیے کہ ہجرت کر گیا ہے، پہلے سے بڑھ کر بامعنی ہوگئی کہ وہ اسے خوابوں میں دیکھتا ہے اور دوسرے کے لیے اس کے سارے معنی جاتے رہے کہ وہ اسی دیس میں ہے۔مگر کبھی اس کے یہاں اس بستی کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ہجرت نے روپ نگر کو کتنا بامعنی بنا دیا ہے۔اور صابرہ کو ہندوستان میں ٹکے رہنے کی کتنی سزا ملی ہے کہ روپ نگر اس کے لیے بےمعنی ہوگیا ہے۔'' [۲۸]

''گلیاں، چڑیاں اور پیڑ نہ پہچانیں تو دکھ ہوتا ہے، پہچان لیں تو طبیعت اداس ہوتی ہے'' [۲۹]

''بیٹے یہ اس گھر کی چابیاں ہیں جس پر اب تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔' اس گھر کی اور اس زمین کی چابیاں۔ چابیاں یہاں میرے پاس ہیں اور وہاں ایک پورا زمانہ بند ہے،گزرا زمانہ۔مگر زمانہ گزرتا کہاں ہے گزر جاتا ہے، پر نہیں گزرتا۔آس پاس منڈلاتا رہتا ہے اور گھر کبھی خالی نہیں رہتے۔مکین چلے جاتے ہیں تو زمانہ ان میں بسا نظر آتا ہے۔'' [۳۰]

ہجرت خواہ جبری ہو،خواہ لوازماتِ زندگی کے بہتر حصول کے پیشِ نظر،نئی جگہ نئی اقدار و روایات، ثقافت، تہذیب زبان کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔لہٰذا گزرا ہوا ماضی ،اس کی یادیں ،تہذیب و ثقافت، گذشتہ طرزِ زندگی کو بھی دروازے کے باہر ہی چھوڑنا پڑتا ہے۔اورآگے بڑھ کر زندگی کے سامنے موجود چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا ان کا اگلا ناول آگے سمندر ہے میں اس احساس مہاجرت کو سمجھنے،ہجرت کا تجزیہ کرنے کی ایک کوشش ملتی ہے۔اگر چہ بستی میں ان کے ہاں ناسٹلجیا ہے لیکن انتظار حسین کا ناسٹلجیا ماضی پرستی سے جنم نہیں لیتا ۔''آگے سمندر ہے'' بستی کے موضوع کی توسیع ہے۔انتظار حسین کے یہاں مہاجریت کے طرز احساس میں ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے۔ان کے ڈائیا سپورا کردار جو پہلے ناول میں اپنی جنم بھومی کی یادوں میں کھوئے سے ملتے ہیں وہ اگلے ناول میں نئی سرزمین میں نا مساعد حالات سے دو چار ہیں آگے سمندر ہے '' کے مہاجر کردار نئی سرزمین میں جڑنے اور پاؤں جمانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں

عبداللہ حسین کے یہاں ہجرت نے مابعد نوآبادیاتی دنیا میں بیرون ملک مقیم لوگوں کی مصائب اور مشکلات سے جنم لیا ہے ۔عبداللہ حسین کے کردار یا (Diaspora) دیارِ غیر میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین اپنے پیچھے چھوڑ آنے والے افرادِ خانہ کی بہتر زندگی اور مادی لحاظ سے خوشحالی کا حصول

ہے۔۔''عبداللہ حسین نے بڑے پیمانے پر ہونے والی نقل مکانی کے تحت عمل میں آنے والے انسانی بکھراؤ (diaspora) کو پیش کیا ہے''[۳۱]

یہ جلا وطن اجنبی سرزمینوں میں اپنی تقدیر کو سنوارنے کے لیے ہجرت کر گئے ہیں یہ ہجرت عموماً نو آبادیاتی نظام سے مابعد نو آبادیاتی نظام کی طرف ہجرت ہے۔جس کا مقصد محض خوشحالی کے اس سراب کے پیچھے بھاگنا ہے جو جدید دور میں خوشیوں کا واحد معیار بن چکا ہے۔عبداللہ حسین کے یہ کردار معاصر زندگی کی سچی اور بے لاگ تصویر پیش کرتے ہیں لیکن اس عمل میں بھی وہ ثقافتی سطح پر مغائرت کے کرب میں ضرور مبتلا دکھائی دیتے ہیں ان کے کرداروں میں بے نام سی یاس انگیزی، کرب، بے شناخت ہونے، جڑ سے اکھڑنے کا دکھ، نئے ماحول میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا عزم لیکن ساتھ ہی اپنے ماحول سے کٹ کر زندگی کرنے کا کٹھن مرحلہ انھیں درپیش رہتا ہے۔

عبداللہ حسین کے یہاں ڈائیا سپورک طرزِ احساس کی نمائندگی کرنے والے ناولٹوں میں جلا وطن ،واپسی کا سفر، ندی، نشیب شامل ہیں۔ان ناولٹوں میں عبداللہ حسین نے دیار غیر جا بسنے والوں کے احساس سود و زیاں کے گرد کہانی کا تانا بانا بنا ہے خصوصاً ''جلا وطن'' اور ''واپسی کا سفر'' اپنے ملک کی سرزمین چھوڑ کر جانے والوں کے جذباتی اور فکری انسانی مسائل کے متعلق آگہی دی گئی ہے۔ان تجربات کو عبداللہ حسین نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور انھیں اسی :

شدت بے باکی اور حقیقت پسندی سے پیش بھی کر دیا ہے''[۳۲]

ڈاکٹر انوار احمد عبداللہ حسین کے احساس مہاجریت کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''ان کے افسانوں میں بہت بڑا حوالہ جلا وطنی کا ہے۔، یہ ایک اور طرح کی ہجرت ہے جس کا تجربہ بہت سے پاکستانی کر رہے ہیں اس کے اسباب تہذیبی، فکری اور سیاسی بھی ہیں۔مگر غالب وجہ فکرِ معاش ہے یا معاشی خوشحالی کی آرزو، جو ایک بڑی تعداد میں پاکستانیوں کو دیارِ غیر میں جا بسنے پر اکساتی ہے، بالائی متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ اور ہنر مند نوجوانوں کے لیے یہ محض حصولِ روزگار کا کرشمہ نہیں ،نسبتاً لبرل ماحول کا لپکا بھی ہے۔دیارِ غیر میں جس طرح یہ آفاقی حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آج کا انسان بنیادی طور پر تنہا اور دل گرفتہ ہے۔اس کی باطنی کائنات بے یقینی اور ڈس الوژمنٹ کی وجہ سے بے کشش ہو چکی ہے۔علم اور خبر اس کے لیے دکھ کا چشمہ ہے وقت کی تیز رفتاری سفاک بن چکی ہے۔اور صنعتی ترقی کا میکانکی خبر نامہ معاشرے کو خوشحال اور فرد کو بے حال کیے جا رہا ہے، ماضی (تاریخ ،فلسہ اور عقیدہ) ٹکڑوں میں بٹ کر یاد کو اذیت ناک بنا رہا ہے، اس نسل کو اپنی بقا کے لیے محبت اور رفاقت کی ضرورت ہے۔مگر یہ لمحاتی فریب بن کر آزردگی اور افسردگی کو بڑھاوا دیتی ہے، افراد کی بجائے اشیا اس کا مطمح نظر بنتی ہیں جو رفاقت تو کیا فتح مندی کے سچے جذبہ کو بھی ابھرنے نہیں دیتی:'' [۳۳]

''مجھے سمجھ نہیں آتی پھر اسے کس بات کا غم ہے کبھی کبھی میری کی بات یاد آتی ہے میں سوچتا

ہوں میری ٹھیک ہی کہتی ہوگی۔شاید عورتیں بھی بے وطن ہوتی ہیں مجھے اپنی ماں اور بہن کا چہرہ یاد آتا ہے۔میں کہتا ہوں عورتیں ہوں یا مرد سب اس دنیا میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں ...خدا جانے یہ کیسی کیفیت ہے اب تو دل میں ایک ہی خواہش ہے کہ جلدی جلدی ہسپتال سے نکلوں اور اپنے گھر پہنچوں، دل کو کچھ چین آئے، باقی تو سب آرام ہے۔'' [۳۴]

''جلا وطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارہ نہیں پا سکتا، چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو....کیسی عجیب بات ہے'' [۳۵]

مستنصر حسین تارڑ کے یہاں اس جلا وطنی کا اظہار ان کے تین ناولوں بالخصوص 'دیس ہوئے پردیس' اور 'اے غزالِ شب' اور کچھ حد تک راکھ میں دیکھا جاسکتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ کا بنیادی تخلیقی تجربہ سفر یا سیاحت کا ہے۔ ان کی وسعت مطالعہ اور متنوع انسانی تجربہ ان کی تخلیقات کی بنت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تخلیقات میں جہاں عصری و سیاسی معلومات، شوبز کی تکنیک، کلچر کی معلومات کے مختلف ٹریک ملتے ہیں وہیں وہ اپنی تحریروں میں وطن کی مٹی کی ہمک سے گہرائی اور فینٹاسی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خاصے کامیاب رہتے ہیں ۔مستنصر حسین تارڑ قلم کے ایسے مزدور ہیں جنھیں ان کے متنوع تجربات نے طاقت ور بیانیہ عطا کیا ہے۔لہٰذا جہاں وہ اپنے فن کی بنیاد چند اساسی عناصر پر رکھتے ہیں اور کچھ حد تک نظریہ سازی کا عمل ان کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔وطن کی مٹی سے جدا ہونے اور پھر جڑنے کا عمل، دریاؤں کا خشک ہونا، وقت کی تیزی اور بے رحمی، موت، رومان پرور فضائیں، پنجاب کی دیہی فضا، دیسی زبان کا تڑکا وہ چیزیں ہیں جو ان کے طاقت ور بیانیہ کے ساتھ مل کر ناولوں میں گہرائی پیدا کرتی ہیں ۔مستنصر کے فن سے اس رومانویت کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ مستنصر کے یہاں جلاوطنی ان کے معاصر ہم وطن ادیبوں سے مختلف احساس لیے ہوئے ہے۔کہ فرد کی نجات کسی زیادہ ترقی یافتہ معاشرے میں جذب ہونے کی کوشش میں نہیں ہے بل کہ اپنی دنیا کو تبدیل کرنے، وطن کی مٹی سے جڑنے، اپنے پشتینی وطن کی طرف واپسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ان کے یہاں ہجرت کا ردعمل وطن کی مٹی سے وابستگی، کلچر، زبان، گلیاں چوبارے اپنی ذات میں

سمونے اور محفوظ کرنے کی بے ساختہ خواہش کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر عموماً غیر معمولی یا رومانوی کردار رہتے ہیں ۔

ڈاکٹر ارشد خانم رقم طراز ہیں :

''لیکن ذلتوں کے اسیر یہ لوگ اپنا مذہب، اپنی تہذیب، اپنا وطن سب کچھ چھوڑنے کے باوجود اپنا مقدر بدلنے پر قادر نہ ہو سکے۔تہذیبی اور مذہبی بعد کبھی انھیں ایک نہیں ہونے دیتا۔ظہیر اور گالینا ہوں یا ہلٹرڈ اور عارف، جب یہ اپنی مٹی سے بے وفائی کرتے ہیں ۔تو دیارِ غیر کی مٹی بھی انھیں قبول نہیں کرتی۔ایسے میں ظہیر الدین کی سوچیں بار بار

ماضی کی طرف پلٹتی ہیں ۔ یہاں ہمیں ناول نگار اس ناسٹلجیائی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے جو انتظار حسین

کی سوچوں کا خاصا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ انتظار حسین ہندوستان سے ہجرت کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں جب کہ تارڑ بوریوالہ کے دیہاتی کلچر کے عشق میں مبتلا نظر آتے ہیں۔آک کے بوٹے یا سیمل کے درخت سے جنم لینے والی مائی بوڑھیاں ہر قدم پر ظہیر کا دامن تھام لیتی ہیں کیوں کہ جو۔۔۔''اپنے موسموں،شجروں اور مٹی کی مہک کو بھلا بیٹھا ہو۔۔۔ہمیشہ بڑھاپے کی دہلیز پر ایک وقت ایسا آجاتا ہے۔جب وہ سارے موسم ،شجر اور مٹی کی مہک گمشدگی میں سے ظاہر ہو کر اس کے اندر پھوٹنے لگتے ہیں اور اسے اپنی قبر بلاتی ہے۔''(اے غزال شب،ص۱۳۳)[۳۶]

ان کے ڈائیا سپورک کردار ایک پسماندہ معاشرتی پس منظر کو چھوڑ کر ایک ترقی یافتہ معاشرے میں جذب ہونے کی کوشش میں کسی بھی شدید جذباتی کش مکش میں مبتلا نہیں ہوتے۔مستنصر حسین کے ڈائیا سپورک کرداروں میں ولیم سفران کی تجویز کردہ تمام خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں ۔ جو وہ ہندوستانی ڈائیا سپوراز کے لیے تجویز کرتے ہیں ۔مستنصر کے کردار بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ میزبان ملک میں جڑیں نہیں پکڑ سکتے ۔وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اپنے وطن واپس جانا ہے۔لہذا نئے ملک میں اجنبیت اور بے گانگی ان کی ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔وہ اپنے آبائی وطن کو اپنا اصل وطن قرار دیتے ہیں جہاں ان کے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں اور جہاں انھوں نے بھی دفن ہونا ہے ۔اجنبی دیس کی اجنبی اور سرد مہر زمین میں دفن ہونا انھیں قبول نہیں ۔لہذا جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے انھوں نے یا ان کی اولاد کو واپس جانا ہے۔اپنے وطن کی بہتری ،تحفظ اور خوشحالی کا خیال انھیں ہر دم ستاتا رہتا ہے۔مستنصر کے یہ مہاجر کردار دیارِ غیر میں اپنی تہذیب وثقافت کی پاسداری کا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔تو وہیں اپنی اولاد کو مغرب کے رنگ میں رنگتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے:

> ''ہم یہاں جڑیں پکڑ گئے ہیں جوگی اوئے جوگی....ہم یہاں کے بوٹے نہیں ہیں پر جڑیں پکڑ گئے ہیں ،اب ہم نہ مرتے ہیں اور نہ بڑھ کر درخت بنتے ہیں....بس اسی طرح کے اسی طرح رہتے ہیں...کھایا پیا اور اتنے ہی رہے جتنے تھے...''[۳۷]

> ''تم اگر وطن میں مرتے تو ہمارے گھر کا آنگن سوگواروں سے بھرا ہوتا....مجھے پردیس میں چھوڑ کر جا رہے ہو مجھے پہلے اپنے دیس تو لے جاتے پھر چلے جاتے...تمھیں اپنے گھر کی مٹی نصیب نہ ہوئی''[۳۸]

مستنصر کے یہاں وطن سے وابستگی کا جذبہ نظریاتی شکل اختیار کر لیتا ہے اس سلسلے میں ان کا اپنا ایک تھیسس ہے:

> ''لیکن یہ بات بھی ناقابلِ تردید ہے کہ اگر آپ ایک طویل مدت اپنی مٹی سے جدا رہیں تو وہ بے وفا ہوجاتی ہے تمہیں پہچاننے سے انکاری ہو جاتی ہے ایسے میں واپسی کے راستے بھی مسدود ہوجاتے ہیں۔''[۳۹]

> ''وطن دراصل وہ ہے جہاں ۔۔۔آپ کے وجود کی ضرورت ہو۔۔۔آپ کو چاہنے والی کچھ ایسی روحیں موجود ہوں،جن کا گزارہ آپ کے بغیر نہ ہو سکے۔۔۔۔جس کی خوراک،آب و ہوا اور ثقافت کے آپ عادی ہوجائیں''[۴۰]

یہ وہ خصوصیات ہیں جو مستنصر کے ناول دیس ہوئے پردیس[۱۹۹۹،سنگ میل پبلی کیشنز] میں دیکھی جاسکتی ہیں جب ناول کا مرکزی کردار برکت علی اپنے پردیس میں پلے بڑھے بدیسی بچوں کو وصیت کے ذریعے اپنے پشتینی وطن میں کچھ عرصہ گزارنے کی شرط رکھ دیتا ہے۔اور یوں پنجاب کے دیہات کو رومان انگیز فضا میں تبدیل کردیتا ہے۔اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں آنے والے ان کے دوسرے ناول ائے غزال شب میں بھی مستنصر حسین تارڑ کے یہاں وطن کی مٹی سے لگاؤ کے اس احساس کو دوبارہ دیکھا جاسکتا ہے اگرچہ دونوں ناولوں میں زمانی بعد ایک عشرے سے زیادہ ہے اس کے باوجود دونوں ناولوں میں مہاجریت کے طرزِ احساس میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی جاسکتی۔یہ ان کی تخلیقات کا وہ نقطہ ہے جہاں ہمیں ان کے کردار بدلتے ہوئے حالات کے تحت نئی ترجیحات (Ground realities) کو پیش نظر رکھنے میں سپاٹ نظر آتے ہیں۔

حسن منظر اکیسویں صدی میں ناول کی صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کا شعور ان کے کرداروں کی بنت میں اپنی جھلک دکھلاتا ہے ہے جو تمام تر زمینی حقائق سے پوری طرح باخبر بھی ہیں ان کے مہاجر کردار اپنے وطن میں مشنری بن کر رہنے کے خواب دیکھنے کے باوجود میزبان ملک کے کلچر اور زبان کا بغور مطالعہ بھی کرتے ہیں اور مکالمہ بھی۔رد وقبول کے مخمصے سے بھی گذرتے ہیں۔اور نسبتاً ایک ایسا رویہ جو معاصر زندگی کی روح کے عین مطابق ہو ،پیش کرنے کی جرأت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

اکیسیویں صدی کے پہلے عشرے میں ،پوسٹ کالونیل مطالعہ میں ڈائیا سپورک طرزِ احساس کو حسن منظر نے اپنے ناول ''دھنی بخش کے بیٹے'' میں وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں ہجرت نہ تو تہذیبی زوال کی صورت میں نظر آتی ہے۔اور نہ ہی وہ اسے ماضی کا نوحہ بناتے ہیں۔بل کہ ان کے ہاں اس بکھراؤ کا احساس تجزیاتی سطح پر نظر آتا ہے۔ان کا وسیع مطالعہ،بالغ نظری انسانی بصیرت کا فہم انھیں مختلف اقوام کے یہاں موجود جلا وطنی کے طرز احساسات کا نبض شناس بناتے ہیں۔اگر حسن منظر کے یہاں ناسٹلجیا ہے یا وہ ہجرت کے تخلیقی تجربہ کے امین ہیں تو بھی اسے وہ ایک اور ہی جہت سے روشناس کراتے ہیں۔وہ اس تجربہ کو محض ماضی کی باز آفرینی یا تہذیبی نوحہ کے طور پر پیش نہیں کرتے بل کہ نسبتاً وسیع تر تناظر میں اس کا تجزیہ دیگر اقوام کے احساس جلا وطنی،بکھراؤ اور انتشار کی تفہیم و تقابل میں استعمال کرتے ہیں۔حسن منظر کے ہاں یہ احساس مہاجرت یا جلا وطنی ثقافتی پس منظر مخصوص خطہ زمین،زبان،مشترک اقدار،اور کسی ایک معاشرے سے کٹ جانے کے یاس انگیز احساس زیاں سے نہیں ابھرتا۔

بل کہ وہ اس روش یا طرزِ عمل کا اعادہ مابعد نوآبادیاتی تناظر میں کرتے ہیں۔وہ وقت کے اس بدلاؤ کو مثبت یا منفی نظریوں میں بانٹنے کی بجائے اسے آج کے انسان پر روح عصر کے ناگزیر مطالبہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

حسن منظر کی بصیرت جلا وطنی کو مختلف اقوام کے تجربہ اور اجتماعی لاشعور میں پنہاں طرز احساس کے مطالعہ کے طور پر پیش کرنے صلاحیت کی رکھتی ہے۔خصوصا ان کا وسیع مطالعہ اور فطرت انسان سے واقفیت انھیں دیگر اقوام کے یہاں سرزمین سے جڑی حساسیت کے ادراک اور اظہار میں مدد دیتی ہے۔مثلاً ان کے دو مختصر ناول میں وہ

یہودی کردار رابیکا اور اس کی یہودی قوم کے طرزِ احساس کو بڑی بے باکی اور جرأت سے بیان کردیتے ہیں۔ یہودی جو wandring jews ہیں اور ان کی قوم جو ماضی کی قرض دار ہے۔اب بھی کس ذہنی جلا وطنی کا شکار ہے:

> ''اس دم یہ ربیکا کے لوگوں کا ملک تھا۔اور وہ اس کے حاکم تھے لیکن اس وقت کوئی ان سے بھی زیادہ طاقتور چیز ان پر حکمرانی کر رہی تھی۔۔۔خوف اور ایک دوسرے پر بھروسہ کی کمی۔انھیں ہر دم خود کو یقین دلاتے رہنا پڑتا تھا۔کہ وہ یہاں کے تھے۔،یہاں سے کبھی رخصت نہ ہونے کے لیے کیوں،بس زمین کے اتنے ٹکڑے کا ہی کیوں،خود کو ساری زمین کا نہیں سمجھ سکتے تھے؟جس طرح دنیا بھر میں بکھرےہوئے یہودی(Diaspora)زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں کھینچ بلائے گئے تھے۔اور اس میں سمانے کی کوشش کر رہے تھے میرے تصور سے باہر تھا۔میں نے ان دو دنوں میں اسرائیلیوں کو ان یہودیوں پر شک کرتے سنا اور دیکھا تھا جو اس ارضِ موعودہ میں چند دن آ کر ٹھہرتے تھے۔یہاں کے دیکھنے والے مقامات دیکھتے تھے۔اور پھر امریکا جانے والے ہوائی جہاز میں یہاں کی نشانیاں لے کر سوار ہو جاتے تھے۔جو یہودی گورے نہیں تھے زندگی سے بیزار نظر آتے تھے۔وہ اتنے خوش قسمت نہیں تھے کہ امریکا یا اپنے وطن پھر سے اُڑ جائیں۔میرا خیال ہے وہ اپنی قسمت کو روتے ہوں گے کہ کہاں آن چھپے۔اپنے ملک میں خوش تھے۔وہاں ہر دم جان کا کھٹکا تو نہیں تھا''[۴۱]

ان کے یہاں ڈائیاسپورک احساس میں دو مختلف کلچرز میں سماجی اقدار کے تضادات کا شدید عکس یا ردِعمل ملتا ہے۔جو مہاجرین اور میزبان کلچر کے مابین اختلاط و ارتباط سے جنم لیتا ہے۔قرۃ العین حیدر کی مانند اگرچہ ان کے کرداروں میں بھی یہ احساس جلاوطنی موجود رہتا ہے۔کہ وہ جس وطن میں ہیں وہ ان کا پشتینی وطن نہیں ہے۔لیکن ان کے کردار آج کے زمانہ کے باشعور کردار بھی ہیں جن کیلیے اپنی اور اولاد کی بہتر ،اور محفوظ زندگی جذباتی وابستگیوں سے کہیں زیادہ معنی رکھتی ہیں۔ان کے کردار مستنصر حسین تارڑ کے کرداروں کی مانند اس رومانیت کا شکار نہیں ہوتے جو اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونے اور اپنی ان نسلوں کو وطن میں واپس لانے (جہاں کے وہ تھے لیکن مختلف معاشروں میں پروان چڑھنے کے سبب اب وہاں کے نہیں رہے تھے۔) کی شدید خواہش سے جنم لیتی ہے۔حسن منظر کے یہاں کردار وطن اور اس سے جڑی ماضی کی یادوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کے باوجود حال میں موجود پیش منظر کا حقیقت پسندانہ ادراک رکھتے ہیں۔اور وہ ہی لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں جو کہ ایک باشعور فرد کو زمینی حقائق(Ground realities) کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیے:

> ''ہاں میں اسے یہ ضرور بتانا چاہتا تھا کہ کتنی بار میں یہ فیصلہ کرتے کرتے رہ گیا تھا کہ برطانیہ کو خدا حافظ کہوں ؛جس کا میں شہری تھا جس کے وسائل سلطنت کی طرح سکڑتے چلے جا رہے تھے۔اور جہاں مجھے بارہا کھال کی وجہ سے بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔یہ بھی کہ آسٹریلیا یا

کینیڈا میں جا بسنے کا ارادہ میں نے کئی بار کیا تھا مگر ان دو ملکوں میں جو ملکہ عالیہ کے سایہ عاطفت میں تھے مجھے مناسب پوسٹ نہیں ملی۔اور اپنے اجداد کے ملک کو لوٹنے پر نہ بیوی تیار تھی نہ بچے۔سو نہ چاہتے ہوئے بھی میرا کنبہ برطانیہ کی شفقت سے عاری بانہوں میں تھا''[۴۲]

ان کے یہاں مہاجرین یا انتقال آبادی کا باشعور اور حقیقت پسندانہ ویژن اپنی جگہ اہم ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کے کردار بھی گم شدگی کے حساس، منقسم ذات، اجنبی پن اور مغائرت کے احساس سے اپنا دامن نہیں چھڑا پاتے۔اور اجنبی سماج یا کلچر میں چیزوں کو اضداد کے حوالے سے دیکھنے کے مابعد جدیدی رویہ کو اپناتے ہیں:

''آہ مگر ہم ویرانے اور آبادی کا مقابلہ کر رہے ہیں دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے، امریکہ جذبات کا ویرانہ ہے۔چین اور تمھارے ملک اخوت کے سمندر ہیں۔جن میں کوئی خود کو گم نہیں کر سکتا۔لاکھ ہاتھ چھڑاؤ کوئی نہ کوئی پکڑ لے گا''[۴۳]

''چوک وان نے کہا اس کا خوف اسے چین لے گیا۔جہاں سے وہ گیارہ سال کی عمر میں آئی تھی۔وہاں اس کے بھائی کی اولاد ہے بہنیں ہیں۔یہاں رہتی تو مینٹل ہسپتال میں اسے پناہ دی جاتی۔یہاں ایک بات بڑی عجیب ہے۔جس کے مسائل کا حل نہ ہو، اسے مینٹل ہسپتال پہنچا کر سوسائیٹی کا ضمیر آرام سے سو جاتا ہے۔''[۴۴]

''اولا کا دماغ وہ تھا جو پچھلی چند صدیوں میں یورپ اور امریکہ کے باشندوں کا بنا ہے۔با آسانی ہر آب و ہوا میں کسی بھی زمین میں لگ جانا۔اور وقت آنے پر پھول اور بیج دینے لگنا۔اس کے برخلاف مشرق کے لوگ جہاں جاتے ہیں اپنا بستر بند صرف رات کو سونے کے لیے کھول کر بچھاتے ہیں۔اور کسی بھی وقت وہاں لوٹ جانے کے لیے خود کو تیار رکھتے ہیں۔اپنی جڑیں اس زمین میں پھیلنے نہیں دیتے۔''[۴۵]

''تو کیا میں یہاں اکیلا رہوں گا۔ایک دن اپنے بیڈ روم میں مردہ پایا جاؤں گا۔اور لوگ فیصلہ کریں گے اس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔نہ کوئی قریبی رشتہ دار ہے، مجھے میرے بہترین سوٹ، سوکس، جوتوں اور اچھی اسٹارچ لگی قمیض میں ٹائی میں، کریمے ٹوریملے جائیں گے...وہ کریمے ٹوریم سے میری راکھ بھی نہیں لیں گے۔وہ ان کے کس کام کی ہوگی۔میں، مجھے لگتا ہے میں اپنے پیچھے نہ نام چھوڑوں گا نہ نشان''[۴۶]

''موجودہ دور میں جب پڑھے لکھوں کے دل اپنے ملک سے بھر چکے ہیں اور وہ محبت کرنے کے لائق کچھ زیادہ ہیں بھی نہیں، اپنے ملک سے محبت برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس سے دور رہا جائے جس طرح بعض لوگوں سے بس کبھی کبھی ملاقات ہوگئی کبھی کبھی وہاں ہو آئے۔''[۴۷]

ہومی کے بھا بھا 'دی کولیشن آف کلچر میں لکھتے ہیں''ہم عصر تنقیدی نظریات کی وسعت اس امر کی شاہد ہے کہ ہم ان لوگوں سے جنھوں نے تاریخ کی سزا بھگتی ہو،غلامی، غلبے،بکھراؤ (Daispora) بے مکانی....زندہ رہنے اور سوچنے کے دیرپا سبق سیکھتے ہیں[(۴۸)

اس میں کوئی متشکک آمیز بات نہیں ہے کہ ادب کی جو بھی جہت ہو وہ انسانی زندگی کے تنوع،تغیر اور آنے والی وقت کی کروٹوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ڈائیا سپورک ادب اس لحاظ سے وہ ہی کردار ادا کرتا ہے۔جو کسی نئے معاشرے اور سماج میں کلچر اور روزمرہ کو سمجھنے میں جلا وطنوں کو وہاں موجود ہم وطن فراہم کرتے ہیں۔یہاں ادب کے سنجیدہ قارئین اور لکھاریوں کو بھی سمجھنا ہوگا۔کہ ادب میں وہ جن اقدار کو فروغ دے رہے ہیں وہ اس گلوبلائزیشن دور میں فرد کی بہتری اور اس کے ترقی پذیر شعور کے لیے کس قدر مثبت یا مؤثر کردار ادا کررہی ہیں ۔ایک طرف وہ ادیب ہیں جو جلا وطنی کو ماضی سے جڑی یادوں ،گم گشتہ جنت (پشتینی وطن) اور تہذیبی نوحہ کا مقام دے رہے ہیں ۔تو دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو ترکِ وطن کے لیے نئے آنے والے زمانوں کے چیلنجز کے نمٹنے کے لیے آگاہی دے رہے ہیں۔ مثبت رویے ،مثبت سوچ اور اقدار پر مبنی تصورات سے فرد کی تہذیب کر رہے ہیں ۔ ڈائیا سپورک ادب اس وقت علمِ بشریات اور کلچر کی تفہیم میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔اس ادب کا مطالعہ تارکین وطن کے معاشی ،معاشرتی اور ثقافتی رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔مابعد نوآبادیاتی دور میں ہجرت ایک بالکل مختلف تناظر میں سامنے آتی ہے۔مختلف سماجوں اور کلچر کا تضاد اپنی جگہ لیکن آج کا دور ماضی سے چمٹنے کی بجائے حال کا ماضی سے تقابل اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا دور ہے۔فرد کیلیے زندگی متحرک اور مختلف النوع افراد سے معاملہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔لہذا آج کے ادیبوں کو اس یاس انگیزی سے نکل کر جو مسافرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے عملی تصورات سے مزّین کرنا چاہیے۔

حواشی وحوالہ جات:

(۱) ہجرت ونقل مکانی کی تاریخ اور مختلف اقسام کے مزید مطالعہ کے لیے دیکھئے،روبینہ الماس، **اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار**،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۱۲ءصفحات ۳۶ تا ۱۲

(۲) دیو یندر اسر،قرۃالعین حیدر۔۔۔جلا وطنی کا ذاتی اور تہذیب المیہ،مشمولہ **سطور** خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر، کتابی سلسلہ۴،بیکن بکس ملتان،۲۰۰۳ء،ص۱۲۵

(۳) روبینہ الماس،**اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار**،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۱۲ء،ص۲۰

(۴) روبینہ الماس،**اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار**،ص۲۱

(۵) اسٹورٹ ہال کا شمار ماہر عمرانیات وتمدنی نظریہ سازوں میں ہوتا ہے۔ان کا خاص میدان ہی کلچر کے مطالعہ سے ہے برمنگھم یونیورسٹی اور اوپن یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔برطانوی کلچرل اسٹڈیز کا میدان ان کی پہچان رہا۔ان کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:

.en.wikipedia.org/wiki/tuart_hall_(cultural_theorist)Dr Eleni sider,debating diaspora:from typologies to postmodern diaspora,website;transtexts.revus.org/247

(۶) مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:

website: en.wikipedia.org/wiki/diaspora

(7) william safran,Diaspora in Modern societies:myths of home and returns,from Diaspora:A journal of transnational studies ,volume 1,number 1,spring 1991,pp,83.99

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ولیم سفران احساس مہاجریت کے لیے یہودی ہجرت کو بطور رول ماڈل پیش نظر کیوں رکھ رہے ہیں جب کہ ان کے سامنے فلسطینی، چینی، آرمینی اور ہندوستانی ڈائیاپورا کی مثالیں بھی موجود ہیں ایسے میں کسی ایک ہی قوم یا کمیونٹی کو بطور مثالی انداز میں پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔؟ جب کہ بعد میں ۱۹۹۷ء میں کلف فورڈ اور گذشتہ عشرے سے ہومی کے بھابھا نے اس اصطلاح کو وسیع تر تناظر اور متنوع جہات میں استعمال کیا ہے۔

(۸) صغرا افراہیم پروفیسر، **۲۱ صدی کے ابتداء میں اردو افسانہ**، شعبہ تحریر و پیش کش، تبیان ۲۰۱۱/۱۹/۲۹۹، ویب سائیٹ www.tebyan.net/index.aspxpid=19664

(۹) ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ''سفید خون کی سیاست''، مشمولہ **کہانی گھر**، کتابی سلسلہ ۴/۳، شمارہ اپریل ستمبر، ۲۰۱۲ء ص ۱۵۹

(۱۰) انور سین رائے، اردو ادب کے مابعد نوآبادیاتی مطالعے، **بی بی سی اردو ڈاٹ کام**، کراچی، ۲۲ جولائی ۲۰۱۳ء

(۱۱) صفات علوی ڈاکٹر، **فلسفہ مابعد جدیدیت:تنقیدی مطالعہ** از عمران شاہد بھنڈر، بریڈ فورڈ ویسٹ یارک شائر ویب سائیٹ

http://www.nadiatimes.com/archives/30_04_204/page_4_larg_html

(۱۲) ممتاز احمد ڈاکٹر، **اردو ناول کے ہمہ گیر سرو کار**، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۱۰

(۱۳) شہزاد منظر، **پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال**، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۷

(۱۴) طاہرہ اقبال، **پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تموجات کے تناظر میں**، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، سیشن ۱۲-۲۰۰۹ء، ص ۱۷۲

(۱۵) یوبندر اسر، ''قرۃ العین حیدر۔۔۔جلا وطنی کا ذاتی اور تہذیب المیہ''، مشمولہ **سطور** خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر، کتابی سلسلہ ۴، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲۱

(۱۶) قرۃ العین حیدر، ''کیا موجودہ ادب رو بہ زوال ہے''، مشمولہ: **نقوش** ،فروغ ادب، لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۵۲

(۱۷) دیوبندر اسر، ''قرۃ العین حیدر۔۔۔جلا وطنی کا ذاتی اور تہذیب المیہ''، مشمولہ **سطور** خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر، کتابی سلسلہ ۴، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲۲

(۱۸) انتظار حسین، ''سیتا ہرن''، مشمولہ **چہار سو**، جلد ۱۴، شمارہ جولائی / اگست ۲۰۰۵ء، راولپنڈی، ص ۳۰

(۱۹) انوار احمد، ڈاکٹر، **اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ**، مثال پبلشرز فیصل آباد، بار دوم ۲۰۱۲ء، ص ۳۹۸

(۲۰) مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے: ''انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر''، مشمولہ **اردو افسانہ روایت اور مسائل**، مرتبہ؛ گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۵۲۹-۵۲۲]

(۲۱) فاروق عثمان، ڈاکٹر، **اردو ناول میں مسلم ثقافت**، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۴۲۳

(۲۲) انتظار حسین ،آگے سمندر ہے ،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۱۹۷۲ء،ص۱۶
(۲۳) ایضاً،ص۷۰
(۲۴) اسلوب احمد انصاری، ایضاً ص۳۸۶
(۲۵) اسلوب انصاری، **اردو کے پندرہ ناول**، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ، اپریل۲۰۰۳ء،ص۳۸۰
(۲۶) انتظار حسین، **بستی**،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار سوم،۱۹۸۴ء،ص۹۹
(۲۷) ایضاً،ص۱۴۰،۱۳۹
(۲۸) ایضاً،ص۱۴۴
(۲۹) ایضاً،ص۱۴۵
(۳۰) ایضاً،ص۲۳۵
(۳۱) روبینہ الماس، **اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار**،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۱۲ء،ص۱۷۱
(۳۲) فرزانہ سید، **نقوشِ ادب** ،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۲ء،ص۴۸۶
(۳۳) انوار احمد ڈاکٹر، **اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ**،مثال پبلشرز،۲۰۱۰، بار دوم، فیصل آباد،ص۴۷۴
(۳۴) عبداللہ حسین، واپسی کا سفر مشمولہ **مجموعہ عبداللہ حسین**،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء،ص۱۱۶۸
(۳۵) ایضاً ص۹۴۵
(۳۶) ارشد خانم ،ڈاکٹر، ’’اے غزال شب‘‘(تبصرہ)مشمولہ **پیلھوں**، شمارہ۶ ،اپریل تا جون۲۰۱۴ء ، پیلھوں پبلی کیشنز، ملتان، ص۱۲۹
(۳۷) تارڑ ،مستنصر حسین، **دیس ہوئے پردیس**،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۹ء،ص۲۲۵
(۳۸) ایضاً،ص۲۳۳
(۳۹) تارڑ ،مستنصر حسین، **اے غزال شب**،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،ص۲۹۶
(۴۰) ایضاً ص۲۲۱
(۴۱) حسن منظر،ڈاکٹر، **دو مختصر ناول**،شہزاد پبلشرز کراچی۲۰۱۰ء،ص۶۰
(۴۲) حسن منظر،ڈاکٹر،**دو مختصر ناول**،شہزاد پبلشرز کراچی۲۰۱۰ئص۱۳
(۴۳) حسن منظر،ڈاکٹر،**دھنی بخش کے بیٹے** ،شہزاد پبلشرز کراچی ،۲۰۰۸ء،ص ۳۰۶
(۴۴) ایضاً،ص ۳۰۷
(۴۵) ایضاً،ص ۳۶۹
(۴۶) ایضاً،ص ۳۷۰
(۴۷) ایضاً،ص۵۷۱
(۴۸) دیو یندر اسر،’’قرۃ العین حیدر۔۔۔جلا وطنی کا ذاتی اور تہذیب المیہ‘‘،مشمولہ **سطور** خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر، کتابی سلسلہ۴ ،بیکن بکس ملتان،۲۰۰۳ء،ص۵۲۰